© rasailojaraid.com

مولانا عزیر گل اسیر مالٹا سے ایک ملاقات

پروفیسر محمد اسلم، استاذ شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

۲۴ جون ۱۹۸۱ء میری ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل کا دن تھا۔ مدتوں سے میرے دل میں مولانا عزیر گل، اسیر مالٹا سے ملنے کی تمنا تھی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے تاریخ مذکورہ بالا کو میری یہ دیرینہ آرزو پوری کردی۔ موصوف کے ساتھ ملاقات کا سبب یوں بنا کہ ۱۶ جون کو شعبۂ تاریخ، جامعہ پنجاب کے چالیس طلبہ وطالبات کا ایک گروپ میری قیادت میں سابق ریاست سوات کے دورہ پر روانہ ہوا۔ میرا یہ ارادہ تھا کہ میں سخاکوٹ کے مقام پر چند گھنٹوں کے لیے رک جاؤں اور طالب علم میرے رفیق کار قمر عباس کی قیادت میں سوات کے صدر مقام منگورہ چلے جائیں۔ میں مولانا عزیر گل سے مل کر منگورہ میں اپنے ساتھیوں سے جا ملوں گا۔ اتفاق سے نوشہرہ پہنچتے پہنچتے ہماری ٹرین سات گھنٹے لیٹ ہوگئی اور ہم نماز مغرب کے وقت نوشہرہ[1] پہنچے۔ ٹرین لیٹ ہوجانے کی وجہ سے مولانا عزیر گل سے ملاقات کا پروگرام عارضی طور پر منسوخ کرنا پڑا۔

سوات میں قیام کے دوران میں میں نے موصوف کے بارے میں استفسار شروع کیا۔

۱ـ نوشہرہ، لاہور کو پشاور سے ملانے والی سڑک اور ریلوے لائن پر ایک اہم جنکشن ہے۔ وہاں سے پشاور صرف ۴۳ کلومیٹر دور ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اتفاقاً ایک روز میں شالامار ہوٹل مَدَین کے منیجر کے دفتر میں اخبار لینے گیا تو دیوار پر ایک کیلنڈر لٹکتا ہوا نظر آیا جس پر اقوال محمود کے عنوان سے مفتی محمود مرحوم کے اقوال درج تھے۔[1] میں نے منیجر صاحب سے، جو بڑے متدین اور باریش بزرگ تھے، کہا کہ وہ ہمارے ہم مسلک معلوم ہوتے ہیں، کیا وہ مولانا عزیرگل کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ اتفاق سے آج ہی مفتی محمود مرحوم کے پرائیوٹ سکریٹری مولانا فضلِ ربی مردان سے مَدَین پہنچے ہیں، ان سے موصوف کے بارے میں معلومات مل سکتی ہیں۔ میں نماز عصر کے بعد مولانا فضلِ ربی کی قیام گاہ پر پہنچا تو وہ بڑے تپاک سے ملے۔ انھوں نے میرے استفسار پر بتایا کہ ان کی بھی بڑے عرصہ سے مولانا عزیرگل سے ملنے کی آرزو ہے لیکن وہ ان کے گاؤں کا نام نہیں جانتے، انھیں صرف اتنی خبر ہے کہ موصوف سخاکوٹ کے قریب کسی گاؤں میں رہتے ہیں۔ میں مولانا فضلِ ربی کے مکان سے بڑا مایوس ہو کر واپس لوٹا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔ میں نماز مغرب سے فارغ ہو کر اپنے کمرہ میں آکر لیٹ گیا۔ ابھی تھوڑی دیر گذری تھی کہ ہوٹل کے منیجر صاحب میرے کمرہ میں آئے اور کہنے لگے کہ سخاکوٹ کے ایک بہت بڑے تاجر اور ٹھیکیدار صاحبزادہ احمد جان ان کے دفتر میں بیٹھے ہیں، ان کا تعلق چونکہ عمرزئی کے مشائخ کے خاندان سے ہے، اس لیے ان سے مطلوبہ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ میں منیجر صاحب کے توسط سے صاحبزادہ صاحب سے ملا تو انھوں نے بتایا کہ ان کے بھائی صاحبزادہ خالد جان سخاکوٹ میں رہتے ہیں، اور وہ ایک بڑی مارکیٹ کے مالک ہیں۔ میں اگر ان سے ملوں تو وہ مجھے مولانا عزیرگل سے ملا دیں گے۔ اگر کسی وجہ سے ان کے ساتھ ملاقات نہ ہو سکے تو میں مولانا عزیرگل کے

---

[1] مَدَین ایک اچھا خاصہ قصبہ ہے۔ وہاں کئی اچھے ہوٹل اور تین مساجد ہیں۔ مَدَین کی تمام آبادی دیوبندی مسلک پر کاربند ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرزند ارجمند میاں عبد الرؤف کو تلاش کروں۔ میاں صاحب کی سخاکوٹ میں ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ میں احمد جان سے مل کر خوشی خوشی اپنے کمرہ میں آیا اور مولانا سے ملنے کا پروگرام بنانے لگا۔

میں نے قمر عباس سے مل کر یہ پروگرام بنایا کہ میں ۲۴ جون کو مَدین سے واپسی پر علی الصبح سخاکوٹ روانہ ہو جاؤں اور قمر صاحب اپنے گروپ کے ساتھ دن کے بارہ بجے مَدین سے روانہ ہوں اور میں سخاکوٹ کے بس اسٹینڈ پر ان کا انتظار کروں گا۔

پروگرام کے مطابق میں مَدین سے صبح ساڑھے سات بجے ویگن میں سوار ہوا اور تقریباً سوا گھنٹے میں منگورہ پہنچ گیا۔ منگورہ سے مجھے پشاور جانے والی بس مل گئی اور میں بٹخیلہ اور مالاکنڈ ہوتا ہوا پونے گیارہ بجے سخاکوٹ پہنچ گیا۔ یہ مقام آزاد قبائلی علاقے میں Settled Area کے بارڈر پر واقع ہے۔ اس لیے وہاں غیر ملکی سامان اور اسلحہ کھلے بندوں فروخت ہوتا ہے۔

سخاکوٹ پہنچ کر معلوم ہوا کہ صاحبزادہ خالد جان کسی کاروباری سلسلہ میں مردان جا چکے ہیں اس لیے میں میاں عبد الرؤف کی تلاش میں نکلا۔ پوچھتے پوچھتے جب میں ان کی دکان پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ افریقہ سے کوئی مہمان آگئے تھے وہ انھیں لے کر گاؤں چلے گئے ہیں۔ میں نے دکان پر موجود ایک درزی سے کہا کہ میں مولانا عزیر گل سے ملنا چاہتا ہوں اس لیے وہ میرے لیے گاؤں تک پہنچنے کا انتظام کر دے۔ اس نے ایک تانگے والے سے بات کی اور وہ بیس روپے میں مجھے وہاں تک لے جانے اور واپس سخاکوٹ لانے پر رضامند ہو گیا۔ یہ آزاد قبائل کے دیہی علاقے میں میرا پہلا سفر تھا۔

سخاکوٹ سے مولانا عزیر گل کے گاؤں سَنے زَئے تک ساڑھے تین میل کا فاصلہ ہے اور ایک کچی سڑک وہاں تک جاتی ہے۔ ایک میل تک نہر کے کنارے کنارے چلتے ہیں پھر ناہموار پتھریلا راستہ شروع ہو جاتا ہے جو کافی تکلیف دہ ہے۔ میں تانگے میں ہچکولے کھاتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوا سے رے ئے کی طرف جا رہا تھا اور میری زبان پر بار بار یہ مصرع آتا:

دشت پڑتا ہے میاں عشق میں گھر سے پہلے

یہ پورا علاقہ بڑا زرخیز ہے اور سڑک کے دونوں جانب دور دور تک تمباکو، ایکھ اور مکئی کے کھیت نظر آتے ہیں۔ تمباکو اور گنا اس علاقے کی خاص پیداوار ہیں۔ یہاں سفید رنگ کی مکئی پیدا ہوتی ہے جو بہت میٹھی ہوتی ہے، قیام پاکستان سے قبل یہ علاقہ بڑا ہی پس ماندہ تھا اور عوام کا معیار زندگی کسی حال میں بھی پتھر اور دھات کے زمانے میں رہنے والے لوگوں سے مختلف نہ تھا۔ قیام پاکستان کے بعد درگئی کے مقام پر دریائے سوات کا پانی روک کر بجلی پیدا کی گئی اور اس علاقے کے ایک ایک گاؤں میں بجلی پہنچ گئی۔ اب گھر گھر میں پنکھے اور کولر چل رہے ہیں۔ دریائے سوات کی ایک نہر اس علاقے کو سیراب کرتی ہے۔ یہاں کی زمین اتنی زرخیز ہے کہ وہ سونا اگلتی ہے۔ بہترین قسم کا ورجینیا تمباکو، جس سے اعلیٰ برانڈ کے سگریٹ بنتے ہیں، یہاں کاشت کیا جاتا ہے۔

سے رے ئے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو سنہ ۱۹۲۶ء میں آباد ہوا۔ اس میں کل ۳۲ گھر ہیں اور کوئی ڈیڑھ صد کے قریب　　　نفوس وہاں رہائش پذیر ہیں۔ مولانا عزیر گل کا مکان گاؤں میں سب سے نمایاں ہے۔ سنا ہے کہ اس کا نقشہ ان کی انگریز اہلیہ نے تیار کیا تھا۔ گھر سے پچاس ساٹھ میٹر کے فاصلہ پر مولانا کا ڈیرہ یعنی مردانہ نشست گاہ ہے اور اس سے متصل ایک مسجد ہے۔ گاؤں میں بجلی موجود ہے اور مولانا کے ڈیرہ میں کولر اور پنکھے چل رہے تھے۔

جب میں ان کے ڈیرہ پہنچا تو برآمدے میں دو تین نوجوان کھڑے تھے۔ میں نے انہیں آمد کا مقصد بتایا تو ایک نوجوان مجھے ایک بڑے دالان میں لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ دستر خوان بچھا ہوا ہے اور چند حضرات پر تکلف کھانا تناول کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میاں عبدالرؤف اٹھے اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو فرمانے لگے کہ وہ بیّنات (کراچی) میں میرے مضامین پڑھ چکے ہیں اس لیے مزید تعارف کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے مجھے بھی کھانے میں شریک کرلیا۔

کھانے میں افغانی طرز پر پکا ہوا پلاؤ تھا، جس میں کشمش اور چھوارے بھی ڈالے گئے تھے۔ اس کے علاوہ مرغ کا سالن، انڈے والا کسٹرڈ، خمیری روٹیاں اور دہی بھی دسترخوان پر موجود تھے۔ مجھے سفر میں ہونے کی وجہ سے کئی روز سے اچھا کھانا کھانے کو نہ ملا تھا، اس لیے اس روز خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ پلاؤ اس قدر لذیذ تھا کہ میں نے اور کسی چیز کو چھوا تک نہیں۔ حرف بشاش کے فاضل مصنف نذیر احمد شیخ نے ایسے ہی مزیدار پلاؤ کو دیکھ کر کہا تھا:

جہاں بھی پلاؤ بگھارا گیا ہے — زمیں سے فلک تک بھپارا گیا ہے
اسی غم میں شیطان مارا گیا ہے — کہ مومن پہ یہ کیا اتارا گیا ہے

حاضرینِ مجلس میں سے مولانا سیّد محمد یوسف بنّوری[1] مرحوم کے فرزند ارجمند مولانا محمد بنّوری، مرحوم کے داماد مولانا محمد طاسین (مجلس علمی کراچی والے)، مولانا احمد صاحب، راولپنڈی کے ایک خطیب مولوی سعید الرحمٰن، جو بسطۃ فی العلم والجسم کی عملی

---

[1] صحیح لفظ بنوڑی ہے۔ مولانا مرحوم نے اسے معرّب کر کے بنّوری اور پھر البنّوری بنالیا تھا۔ بنوڑ راجپورہ (نزد انبالہ) سے شمال مشرق میں نو میل کے فاصلہ پر ایک تاریخی قصبہ ہے۔ مولانا مرحوم کے جدّامجد حضرت آدم بنوڑیؒ امام ربّانی مجدد الف ثانیؒ کے خلیفۂ اعظم تھے۔ تاریخ پاک وہند میں خاندانِ سادات کے بانی خضر خان کے والد اور دادا بھی بنوڑ کے رہنے والے تھے۔ ان کے مزار بھی وہیں ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تفسیر پیش کر رہے تھے، اور مولانا اسمٰعیل بہام جی (جنوبی افریقہ والے) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں دیوبندی حلقے میں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کی وجہ سے اتنا مشہور ہوں کہ میاں صاحب کو مہانوں کے ساتھ میرے تعارف کی ضرورت پیش نہ آئی اور میرا نام سنتے ہی سب نے اہلاً و سہلاً کہتے ہوئے مجھے بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میاں عبدالرؤف نے مولانا عزیر گل سے میرا تعارف کرا دیا۔ مولانا محمد طاسین نے بھی چند جملے ادا فرمائے۔ مولانا کے ہاتھ دھلانے کے لیے مولانا محمد طاسین ایک برتن اٹھا لائے اور مولوی سعید الرحمٰن پانی کا لوٹا لے آئے۔ ان دونوں نے ہاتھ دھلانے کے لیے بڑا اصرار کیا لیکن موصوف کسی طرح بھی رضامند نہ ہوئے۔ مولانا چھڑی کے سہارے دالان سے باہر تشریف لائے اور برآمدے میں جا کر ہاتھ دھوئے اور کلی کی۔

دالان میں متعدد چارپائیاں موجود تھیں جن پر گاؤ تکیے پڑے تھے۔ مولانا ایک چارپائی پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ میں ان کے بالمقابل ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میری داہنی جانب مولانا محمد طاسین اور بائیں جانب میاں عبدالرؤف بیٹھ گئے۔ مولاؒنا کے بائیں طرف ایک چارپائی پڑی تھی، اس پر مولانا اسمٰعیل بہام جی بیٹھ گئے اور ایک دوسری چارپائی پر مولوی سعید الدین نے قبضہ جما لیا۔ اب گفتگو کا آغاز ہوا۔

مولانا عزیر گل نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا "آپ تو مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی جیسے بزرگوں کے ساتھ نشست و برخاست رکھنے والے ہیں، اتنے سمجھدار ہو کر یہاں کیوں آئے۔" میں نے عرض کیا " حضرت آپ کی نسبت حضرت شیخ الہندؒ سے بڑی قوی ہے، اس لیے دل میں آپ کی زیارت کی بڑی خواہش تھی۔" اس پر انھوں نے بڑے انکسار کے ساتھ فرمایا "بھائی! میں ایک عامی ہوں۔ مجھ میں کوئی بزرگی نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پتہ نہیں لوگ کیوں آجاتے ہیں۔ میں نے بہت سے پیروں کو دیکھا ہے۔ وہ بزرگ بن کر مصیبت میں پھنس گئے"۔ میں مولانا کی باتیں نقل کرنا چاہتا تھا لیکن مولوی سعید الرحمٰن نے اشارے سے منع کر دیا کیونکہ موصوف اپنے بارے میں کچھ لکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔

علماء کرام کی جماعت مجھ سے تین گھنٹے پہلے سے رہ رہی تھی اس لیے انھیں مولانا کے ساتھ گفتگو کا کافی موقع مل گیا تھا۔ تاہم وہ ان کی زبان سے مزید باتیں سننے کے متمنی تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں زیادہ سے زیادہ سوال پوچھوں۔

میں نے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کے بارے میں جواب دینے سے گریز کرتے ہیں اور پرانے اطباء کی طرح صدری نسخے اپنے ساتھ ہی قبر میں لے جانا چاہتے ہیں۔ میری بات سن کر مولانا مسکرائے اور فرمایا "اب تمھیں شکایت نہیں ہوگی، لیکن اسے کہیں چھاپ نہ دینا" قدرے توقف کے بعد ارشاد فرمایا" وعدہ کریں کہ ان باتوں کو شائع نہیں کریں گے۔ میری باتیں بکواس ہوتی ہیں اور میں بکواس خوب کرلیتا ہوں"۔ میں نے عرض کیا " حضرت! ہمارے لیے تو یہ ملفوظات ہیں"۔ میری بات سن کر مولانا نے فرمایا" مجھ میں بزرگوں والی کوئی بات نہیں ہے، البتہ میں نے بزرگوں کو دیکھا ضرور ہے" دو تین منٹ کے سکوت کے بعد ارشاد ہوا" تم تاریخ داں ہو تاریخ لکھتے ہو۔ میں نے عرض کیا" حضرت! آپ تاریخ ساز ہیں میں تو صرف تاریخ لکھتا ہوں" مولانا نے فرمایا" اسی لیے میں تم سے ڈرتا ہوں۔ تم بڑوں کے ساتھ بیٹھتے ہو۔ یہ مولوی ہیں۔ میں ان کو کچھ نہیں سمجھتا۔ تم پروفیسر ہو۔ فوٹو لیتے ہو اور لکھتے ہو"۔

میرے استفسار پر انھوں نے فرمایا کہ ایک بار حضرت شیخ الہندؒ نے انھیں حاجی صاحب ترنگ زئی کے نام ایک اہم پیغام دے کر بھیجا[1] حاجی صاحب ان دنوں قبائلیوں کا گھر زو

---

[1] حاجی صاحب کا اصل نام فضل واحد تھا۔ موصوف انگریزی عملداری سے ہجرت کرکے آزاد قبائلی علاقے میں جابسے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔ (باقی ص ۴۹۴ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے خلاف جہاد پر آمادہ کر رہے تھے اور ہشت نگری کے کسی گاؤں میں روپوش تھے۔ مولانا عزیر گل حضرت شیخ الہند رح کا عطا کردہ سوٹا ہاتھ میں تھامے، حاجی صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ (یقین تھا کہ اس سوٹے میں حاجی صاحب کے نام کوئی خفیہ پیغام بند ہو۔)

مولانا نے حاجی صاحب سے کہا کہ حضرت شیخ الہند رح نے فرمایا ہے کہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کر دیں۔ حاجی صاحب نے روپے کی کمی کا عذر پیش کیا تو مولانا نے شیخ الہند رح کی طرف سے انھیں یہ جواب دیا کہ اس کام کے لیے پیسہ نہیں ملے گا۔ بس وہ جہاد شروع کریں۔ حاجی صاحب نے ان کی بات سن کر فرمایا کہ وہ حضرت شیخ الہند رح کی بات سمجھ گئے ہیں۔ مولانا محمد طاسین نے اس سوٹے کی بابت پوچھا تو مولانا نے فرمایا "پتہ نہیں کہاں گیا"۔ مولانا کا حضرت شیخ الہند رح کے ساتھ جو خصوصی تعلق ہے اس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس تبرک کو یونہی ضائع کرنے والے نہیں ہیں۔ یہیں سے اس شبہ کو تقویت ملتی ہے کہ اس سوٹے کے اندر ضرور کوئی خفیہ پیغام بند ہوگا۔

مولانا عزیر گل، حضرت شیخ الہند رح کے جاں نثار خادم کی حیثیت سے سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ حتیٰ کہ مالٹا کی اسیری کے دوران میں بھی انھوں نے اپنے مخدوم کا ساتھ نہ چھوڑا۔ حضرت شیخ الہند رح جب حجاز تشریف لے گئے تو بحری جہاز میں سکنڈ کلاس میں اپنے لیے اور مولانا کے لیے دو برتھ ریزرو کروائیں۔ مولانا چاہتے تھے کہ وہ عرشہ جہاز پر سفر کریں لیکن مخدوم نہ مانے اور اپنے ساتھ سکنڈ کلاس میں سفر کرنے پر اصرار فرمایا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ جن دنوں موصوف مالٹا میں نظر بند تھے تو وہاں جنگی قیدیوں کے کئی کیمپ تھے۔ ان قیدیوں میں کئی نامور ترک جرنیل اور یورپ کے شاہی خانوادوں کے افراد بھی شامل

(حاشیہ بقیہ صہ ۴۸۳) حاجی صاحب نے انگریزوں کے خلاف کئی معرکوں میں حصہ لیا۔ موصوف "تحریک ریشمی رومال" کے ایک اہم ستون تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے۔ ترک فوجی آفیسرز حضرت شیخ الہندؒ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ جب ان کے صاحب السجن حکیم نصرت حسین فوت ہوئے تو جیل کے حکام نے کہا کہ وہ ایک ایسے مرض میں مبتلا رہ کر فوت ہوئے ہیں کہ ان کی میت دفن کرنے کی بجائے جلائی جائے گی حضرت شیخ الہندؒ نے اس پر سخت احتجاج کیا اور جب دوسرے کیمپوں میں یہ خبر پہنچی تو وہاں بھی ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ انگریز آفیسرز اور ڈاکٹرز میّت کو غسل دینا بھی خطرہ سے خالی نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم حضرت شیخ الہندؒ کے اصرار پر میّت کو غسل دینے کی بجائے تیمم کروایا گیا اور میت کو تابوت میں بند کرکے کسی مقامی قبرستان میں بڑی گہرائی پر دفن کر دیا۔

حاضرین میں سے کسی نے دریافت کیا کہ مالٹا میں نظربندی کے دوران میں انگریز انھیں کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں دیا کرتے تھے۔ مولانا نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے موقع کی رعایت سے عرض کیا کہ آزادی کے بعد کسی شخص نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے پوچھا کہ وہ انگریزوں کے عہد میں سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے، اب کیوں سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ شاہ جی نے بڑے معصومانہ انداز میں جواب دیا، میاں! ہم کس سے لڑیں۔ اب تو دشمن بھی شریف نہیں رہا۔" میری بات سن کر مولانا اور حاضرین مجلس مسکرانے لگے۔

میں نے عرض کیا کہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی فردِ واحد حضرت شیخ الہندؒ کا جانشین نہیں ہوا۔ علم تفسیر میں ان کے جانشین مولانا شبیر احمد عثمانی ہوئے اور علم حدیث میں مولانا انور شاہ کشمیری، اسی طرح سیاست میں ان کے جانشین مولانا عبیداللہ سندھی ہوئے اور ان کا زہد و ورع مولانا حسین احمد مدنی کے حصہ میں آیا۔ میں نے مولانا عزیزگل سے اس کی تصدیق چاہی تو انھوں نے فرمایا "یہ شاعری ہے۔" میں اب بھی یہ سمجھتا ہوں کہ میری رائے غلط نہیں ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ ایک بار دیوبند کی عیدگاہ میں سیاسی نوعیت کا جلسہ ہو رہا تھا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یک دم بارش شروع ہوگئی اور جلسے میں بھگدڑ مچ گئی۔ موصوف ان دنوں جوان تھے اور ان کی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔ انھوں نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا "بڑے افسوس کی بات ہے کہ انگورہ میں ترک گولیاں کھا رہے ہیں اور تم بارش کے قطروں سے ڈر کر بھاگ رہے ہو۔ جہاں کہیں بھی ہو، بیٹھ جاؤ۔" مولانا فرماتے ہیں کہ ان کی یہ ڈانٹ کام کر گئی اور اس کے بعد کوئی شخص اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

دوران گفتگو مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم کا نام آیا تو مولانا نے فرمایا "حفظ الرحمٰن بھاگ دوڑ والے بزرگ تھے۔ خوب تھے مفتی عتیق الرحمٰن ہمارے ساتھی ہیں"۔ میں نے عرض کیا کہ ان دنوں موصوف نقرس کے مریض ہیں۔ اس پر مولانا نے دعائیہ کلمات سے انھیں یاد فرمایا۔

میں نے مولانا سے حضرت گنگوہیؒ سے ملاقات کے بارے میں سوال کیا، تو انھوں نے فرمایا "میں نے انھیں نہیں دیکھا"۔ جب میں نے حضرت تھانویؒ کے بارے میں ایسا ہی سوال کیا تو فرمانے لگے "انھیں خوب دیکھا ہے"۔

میں نے ان سے تیے رئے کے معنی پوچھے تو فرمایا کہ پشتو زبان میں تے رئے تحفہ میں دی گئی زمین کو کہتے ہیں۔ یہ گاؤں انگریزی عملداری میں قبائلی علاقے کی سرحد پر واقع تھا اور یہاں آئے دن پٹھانوں میں جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ کسی عالم دین نے فریقین میں صلح کروادی تو انھوں نے بفر سٹیٹ قائم کرنے کی غرض سے تھوڑی سی زمین اس ثالث کو دے دی۔

مولانا نے فرمایا کہ عالمی جنگ سے قبل دیوبند میں ہندو کمزور تھے اور مقامی کانگریس کمیٹی بھی بڑی کمزور تھی۔ اس لیے ہم لوگ کانگریس کے لیے کام کیا کرتے تھے۔ جنگ کا زمانہ تھا کہ انھیں کسی طرح پیشگی اطلاع مل گئی کہ پولیس کانگریس کے دفتر پر چھاپہ مارنے والی ہے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے دفتر کا تمام ریکارڈ غائب کر دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گفتگو کے دوران میں مولانا عزیر گل دیوبند میں اپنے پرانے ساتھیوں کا بار بار ذکر کرتے رہے۔ انھوں نے مولانا محمد میاں انصاری کا ذکر بڑی محبت کے ساتھ کیا اور دیوبند میں مولانا مدنی کی گرفتاری کا وہ مشہور واقعہ سنایا جو ان کے سوانح میں درج ہے۔ میں نے دیوبند کے جشنِ صدسالہ کے موقع پر حضرت شیخ الہند رح کے ایک نامور مرید مولانا مصطفیٰ حسن علوی کے ساتھ اپنی ملاقات کا ذکر کیا تو میری باتیں سن کر مولانا کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

میں نے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے ایک حدیث تبرکاً سنا دیجیے۔ انھوں نے ارشاد فرمایا "نظر کام نہیں کرتی۔ کتاب بھی پاس نہیں ہے"۔ بہر حال موصوف میری بات ٹال گئے لیکن کچھ دیر بعد دوران گفتگو ایک حدیث کا ترجمہ سنا دیا۔ اس پر مولانا محمد طاسین نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا "دیکھیے حضرت نے حدیث کا ترجمہ آپ کو سنا دیا ہے"۔

مولانا عبید اللہ سندھی کا ذکر چھڑا تو مولانا نے فرمایا کہ دیوبند میں ایک زمانے میں ان سے ملنا اور ان کے ساتھ کسی بھی قسم کا رابطہ رکھنا، بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں مولانا عزیر گل ان سے ملتے رہے اور یہ بات دفتر اہتمام والوں کی نظروں میں کھٹکتی تھی لیکن حضرت شیخ الہند رح کے پاس ادب کی وجہ سے وہ ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتے تھے۔ مولانا نے فرمایا "دفتر اہتمام والے اس وقت بھی مجھ سے ناراض تھے اور اب بھی ہیں"۔ مولانا نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ مولانا سندھی، حضرت شیخ الہند رح کے جاں نثار اور بڑے نڈر تھے۔ حضرت شیخ الہند رح ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ سیاست میں سندھی کی پرواز بڑی اونچی ہے اور وہ نیچے نہیں آتے"۔ مولانا نے فرمایا کہ سندھی سیاست میں مشہور ہو گئے ہیں۔ موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ ان میں ایک بڑا نقص تھا کہ وہ ہر شخص پر اعتماد کر لیتے تھے اور اسے اپنا راز دان بنا لیتے تھے۔ اسی وجہ سے تحریک کا

© rasailojaraid.com

راز فاش ہو گیا اور حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء گرفتار ہوئے۔

سیے رپئے میں میری آمد سے قبل مولانا عزیر گل اپنے مہمانوں کو بتا چکے تھے کہ ان کا سال ولادت ۱۳۰۷ھ ہے۔ میاں عبدالرؤف نے مجھے بتایا کہ ان کا تعلق کاکا خیل قبیلہ سے ہے۔ سیے رپئے ان کا وطن نہیں ہے (یہ گاؤں ۱۹۲۶ء میں آباد ہوا تھا) اور مولانا ۱۹۴۵ء میں رڑکی سے نقلِ مکان کر کے یہاں آباد ہو گئے۔ ان کی انگریز اہلیہ نے یہاں آنے سے قبل اپنی ضرورت کے مطابق مکان کا نقشہ تیار کیا۔ سادہ پتھروں سے بنا ہوا یہ مکان اس نیک بخت خاتون کے عزم اور سادگی کا آئینہ دار ہے[1] موصوفہ ۱۹۳۶ء میں مولانا عزیر گل کے عقد میں اور تیس برس کی ازدواجی زندگی گذار کر ۱۴ اور ۱۷ ستمبر ۱۹۶۶ء کی درمیانی شب کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں[2]

مولانا عزیر گل کی تعلیم کا آغاز جبئ مندوری کے پرائمری اسکول سے ہوا۔ یہ گاؤں اٹک سے چھ سات میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ موصوف ابتدا ہی سے لکھنے پڑھنے میں بڑے تیز تھے اس لیے پرائمری کا امتحان بڑے اچھے نمبروں میں پاس کیا اور وظیفہ یاب ہوئے۔ ان کے والد بزرگوار مولانا شاہد گل انگریزوں کے جانی دشمن تھے بدیں وجہ انگریزوں نے انھیں درگئی میں نظر بند کر دیا تھا[3] جب انھیں ان کے وظیفہ پانے کی

---

[1] میم صاحبہ مرحومہ کے بارے میں مولانا مفتی سیاح الدین کاکا خیل کا ایک پُرمغز مضمون ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک میں قسط وار چھپتا رہا ہے۔ وہ بڑی عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں اور اسلام کے لیے انھوں نے بڑی قربانی دی تھی۔

[2] مولانا اسعد مدنی نے تحریک شیخ الہندؒ پر اپنے پیش لفظ میں نکاح کا سال ۱۹۴۰ء لکھا ہے، جو صحیح نہیں۔

[3] مولانا سید محمد میاں نے ان کا نام شہید گل لکھا ہے، جو صحیح نہیں۔ اسی طرح انھوں نے درگئی کو درگائی بنا دیا ہے۔ (تحریک شیخ الہند، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۲۵۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اطلاع ملی تو انھوں نے ان سے کہا کہ اگر انگریزوں سے وظیفہ لیا یا سرکاری اسکول میں تعلیم جاری رکھی تو وہ انھیں گولی مار دیں گے۔ والد بزرگوار کی دلجوئی کی خاطر انھوں نے سرکاری اسکول کو خیرباد کہا۔

اتفاق سے مولانا عزیرگل کے ایک چچا خاصے مالدار تھے اور انھوں نے اپنے فرزند کی تعلیم کا گھر پر انتظام کر رکھا تھا۔ جو استاد ان کے ابن عم کو پڑھانے آتا اس سے موصوف بھی سبق لینے لگے۔ اُن کے مقابلہ میں ان کا ابن عم پڑھائی میں بڑا کمزور تھا اور استاد کی محنت کے باوجود وہ بے ذوق ہی رہا۔ ایک دن ان کے چچا نے اپنے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ وہ اس پر زر کثیر صرف کر رہا ہے اس کے باوجود وہ پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتا۔ چچا کو اپنے مال و دولت پر بڑا گھمنڈ تھا اور اس نے ڈانٹ ڈپٹ کے دوران میں کئی بار دولت کے ضیاع کا ذکر کیا۔ مولانا عزیرگل کو چچا کی یہ بات پسند نہ آئی اور انھیں روپے پیسے سے نفرت پیدا ہو گئی۔ انھوں نے اس روز یہ عہد کیا کہ وہ حصول زر کی بجائے حصول تعلیم پر زیادہ توجہ دیں گے۔

مولانا عزیرگل توکلاً علی اللہ گھر سے نکلے اور پانی پت پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے ایک مسجد میں قیام کیا۔ اتفاق سے اس مسجد کا امام پٹھان تھا۔ اس لیے وہ بڑی مروّت سے پیش آیا۔ چند روز بعد امام صاحب نے ان سے کہا کہ وہ مسجد میں امامت کے فرائض سنبھال لیں کیونکہ وہ اب کسی دوسری جگہ جانا چاہتا ہے۔ انھوں نے امام صاحب کی پیش کش ٹھکرا دی۔

ان کی طرح مسجد میں اور بھی کئی نوجوان مقیم تھے۔ ایک رات جب انھوں نے یہ سمجھ کر مولانا عزیرگل سو گئے ہیں تو باہم صلاح و مشورہ کے بعد انھوں نے دیوبند جانے کا فیصلہ کیا۔ مولانا عزیرگل ان کی باتیں بڑے غور سے سنتے رہے اور اگلی صبح ان سے بھی پہلے دیوبند روانہ ہو گئے۔

دیوبند آ کر مولانا عزیرگل درس نظامی کی ابتدائی کتابیں پڑھنے لگے۔ کافی دنوں تک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کا تعارف حضرت شیخ الہندؒ اور دوسرے اکابرین کے ساتھ نہیں ہوا۔ ایک بار سوات کے مشہور عالم اور نامور مجاہد سنڈا کے مُلّا حج بیت اللہ سے فارغ ہوکر اجمیر ہوتے ہوئے دیوبند آئے۔[۵] دیوبند کے پٹھان طلبہ نے ان کے قیام کا بندوست کیا۔ ایک روز مُلّا صاحب نے مولانا عزیرگل سے کہا کہ وہ حضرت شیخ الہندؒ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ ان کا پیغام حضرت تک پہنچا دیں۔ مولانا عزیرگل حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ سرحد کے ایک نامور عالم دین اور نڈر مجاہد سنڈا کے مُلّا ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا "ان سے جاکر کہو کہ وہ رات کا کھانا میرے ساتھ تناول فرمائیں۔ اور تم بھی ان کے ساتھ آنا"۔ مولانا عزیرگل نے برجستہ کہا "اگر آپ نہ بھی کہتے تو بھی میں ضرور آتا"۔ حضرت شیخ الہندؒ کو ان کی یہ جرأت پسند آگئی اور یہیں سے ان کا تعلق حضرت کے ساتھ قائم ہوا۔

ایک بار مولانا نے حضرت سے درخواست کی کہ موصوف انھیں مرید کرلیں۔ حضرت طالب علموں سے بیعت نہیں لیتے تھے کیونکہ ذکر وشغل سے پڑھائی میں حرج ہوتا تھا ان کے اصرار پر حضرت نے فرمایا "پہلے استخارہ کرکے دیکھ لو کہ تمہیں کہاں سے فیض ملے گا"۔ انھوں نے کہا "حضرت میں استخارہ وستخارہ کچھ نہیں جانتا، بس مجھے بیعت کرلیجیے"۔ چنانچہ ان کے اصرار پر حضرت شیخ الہندؒ نے ان سے بیعت لے لی۔

مولانا عزیرگل نے دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کے علاوہ مفتی عزیزالرحمن عثمانی،

---

[۵] مولوی محمد علی کنٹیب نے انھیں سوات کا بااثر رہنما تسلیم کیا ہے۔ (مشاہدات کابل ویاغستان، مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی، ص ۵۰) حضرت شیخ الہندؒ ان جیسے مجاہدین کے ذریعے آزاد قبائل کو انگریزوں کے خلاف صف آرا کرنا چاہتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری اور میاں اصغر حسین دیوبندی جیسے علمائے کرام کے حضور زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان بزرگوں کے علاوہ موصوف کسی اور کو خاطر میں نہیں لاتے۔ دوران گفتگو انھوں نے کئی بار فرمایا "باقی حضرات پر تو میں نے حکومت کی ہے"۔

مولانا عزیر گل کی پہلی شادی حضرت شیخ الہند رح کی بھانجی کی صاحبزادی کے ساتھ ہوئی۔ ان کے فرزند میاں عبدالرؤف کی مادری زبان اردو ہے اور انھیں پشتو سے کہیں زیادہ اردو پر عبور ہے۔

مولانا عزیر گل نے کچھ عرصہ راندیر، نوا کھالی اور رڑکی کے دینی مدارس میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے لیکن انھیں یہ شغل راس نہ آیا۔ میم صاحبہ کے ساتھ شادی کے بعد انھوں نے رڑکی میں سوختنی لکڑی کا کاروبار شروع کیا اور ۱۹۴۵ء میں سخے رستے چلے آئے۔ یہاں آکر موصوف بالکل ہی گوشہ نشین ہو گئے، گاؤں میں تھوڑی سی زمین ان کی ملک ہے جس سے ان کی گزر بسر ہو جاتی ہے۔ ان کے فرزند ارجمند میاں عبدالرؤف نے خود کو ان کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کے لیے دین و دنیا جو کچھ بھی ہے، والد بزرگوار کی ذات ہے۔

میاں عبدالرؤف کی روایت ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں صوبہ سرحد کے بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں عوام کی رائے دریافت کرنے کے لیے استصواب ہوا تو ایک روز ایک مسلم لیگی مولانا کے پاس آیا اور کہنے لگا "آپ قرآن کو ووٹ دیں گے یا گیتا کو"؟ اس کی بات سن کر مولانا خفا ہوئے اور بڑے تلخ لہجہ میں اس سے کہنے لگے "قرآن کو گیتا کے مقابلے میں رکھنا، قرآن کی توہین ہے"۔ اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ پروپیگنڈہ کے لیے کوئی معقول طریق اختیار کیا جائے۔

سخے رستے ایک معمولی سا گاؤں ہے اس لیے وہاں نماز جمعہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرب وجوار میں بھی کہیں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی تھی اس لیے یہاں آنے کے بعد موصوف کافی عرصہ تک نماز ظہر ادا کرتے رہے، جب سخاکوٹ میں کاروباری مرکز قائم ہوا تو وہاں نماز جمعہ ہونے لگی۔ مولانا پیرانہ سالی کے باوجود نماز جمعہ کے لیے سخاکوٹ جانے لگے۔ اب کچھ عرصہ سے کمزوری کی بنا پر وہاں جانا چھوڑ دیا ہے اور گھر پر ہی ظہر کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ میاں عبدالرؤف نے مجھے بتایا کہ اب وہ مسجد تک بھی چل کر نہیں جا سکتے، اس لیے عموماً گھر پر ہی نماز ادا کر لیتے ہیں۔

اس پیرانہ سالی کے باوجود مولانا صبح تین بجے اُٹھ جاتے ہیں اور باقاعدگی کے ساتھ تہجد کے نوافل ادا کرتے ہیں۔ جب تک میم صاحبہ زندہ رہیں، موصوف تہجد سے فارغ ہو کر چائے نوش فرمایا کرتے تھے۔ اہلیہ کی وفات کے بعد اس معمول میں فرق آ گیا۔ نماز فجر کے بعد موصوف سات بجے تک ورد و وظائف میں مشغول رہتے ہیں۔ ناشتہ کے بعد حاضرین میں سے کسی صاحب سے کوئی کتاب پڑھوا کر سنتے ہیں۔ اس کے بعد دوپہر تک آرام کرتے ہیں۔

مولانا کی صاحبزادی قرآن پاک حفظ کر رہی ہیں، مولانا ان کے ساتھ خود بھی ظہر تا عصر قرآن یاد کرتے ہیں۔ اس دوران میں موصوف کسی سے بات نہیں کرتے۔ نماز عصر کے بعد چائے کا دور چلتا ہے اور پھر ورد و وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ نماز مغرب کے بعد حالات حاضرہ سے واقف رہنے کے لیے ریڈیو سے خبریں سنتے ہیں۔ میاں عبدالرؤف نے مجھے بتایا کہ مولانا رات کو بی بی سی لندن سے اردو میں نشر ہونے والی خبریں بڑی باقاعدگی کے ساتھ سنتے ہیں۔

مولانا عزیر گل کا قد لمبا ہے اور پیرانہ سالی کے باوجود کمر میں کوئی خم نہیں آیا۔ اب بھی ان کی چال میں ایک وقار نظر آتا ہے۔ موصوف سفید کرتہ اور شلوار زیب تن کرتے ہیں اور سفید رنگ کی گول ٹوپی سر پہ رکھتے ہیں۔ ان کا رنگ افغانوں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرح سرخ وسپید ہے۔ نورانی چہرے پر سفید گول ڈاڑھی بڑی بھلی دکھائی دیتی ہے۔ بائیں آنکھ کی بینائی آپریشن کے بعد لوٹ آئی ہے لیکن دائیں آنکھ کی بینائی درست نہیں۔ انھوں نے کبھی چشمہ استعمال نہیں کیا۔ ان کے منہ میں ابھی تک کئی دانت باقی ہیں۔ میں نے میاں صاحب سے دانتوں کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ اصلی ہیں کیوں کہ انھیں تصنع سے نفرت ہے، اس لیے مصنوعی دانت اور چشمہ نہیں لگاتے۔ انھوں نے اپنے فرزند کو یہ وصیت کی ہے کہ ان کی تجہیز وتکفین میں نمائش نہ کریں۔ ان کی یہ بھی آرزو ہے کہ وہ گمنامی کے عالم میں سفر کے دوران میں فوت ہوں تاکہ ان کے جنازہ پر زیادہ مجمع نہ ہو۔

ان کی یادداشت میں ہنوز کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کا ذہن ایک نوجوان کے ذہن کی طرح کام کرتا ہے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ اترپردیش میں گذرا ہے اس لیے موصوف بڑی روانی کے ساتھ اردو میں بات چیت کرتے ہیں۔ ان کے لب ولہجہ میں "پٹھانیت" کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

جب حاضرین نے مولانا عزیرگل سے بادلِ ناخواستہ رخصت چاہی تو انھوں نے خاص طور پر مجھے مخاطب کرکے فرمایا "پھر نہ آئیں"۔ میں نے عرض کیا "حضرت حلوائی کی دکان سے مکھی نہیں ہٹتی"۔ مولانا نے فرمایا "اتنی دور سے آئے ہو، یہاں آکر پچھتائے تو نہیں"؟ میں نے عرض کیا "یہ تو میری زندگی کا ایک یادگار دن ہے۔ خداوند قدوس نے میری ایک دیرینہ آرزو پوری کردی ہے۔ آپ سے مل کر تو میری سندِ لقا مستند ہو گئی ہے۔

مجھے رخصت کرتے وقت مولانا نے فرمایا "سعید احمد اور عتیق الرحمٰن کو میرا سلام کہیں۔ یہ دونوں بڑے لوگ ہیں"۔ قدرے توقف کے بعد فرمایا "وعدہ کرو کہ لڑ کر لکھو گے نہیں"۔ میں نے اس پر سکوت اختیار فرمایا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میرے ساتھ دوسرے مہمانوں نے بھی واپسی کی اجازت چاہی تو مولانا نے سب کے ساتھ معانقہ کیا اور چھڑی کے سہارے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت مجھے کچھ یوں محسوس ہوا کہ ہمارے سامنے ایک عام انسان کی بجائے پوری صدی کی تاریخ کا ریکارڈ چل رہا ہے۔

دوسرے مہمان دو کاروں میں سے رئے آئے تھے اس لیے ایک کار میں میرے لیے بھی گنجائش نکل آئی۔ میں نے تانگہ والے کو کرایہ دے کر رخصت کر دیا اور ان حضرات کی معیت میں سخاکوٹ پہنچ گیا۔ ظہر کی نماز ایک زیرتعمیر مسجد میں ادا کر کے میاں عبدالرؤف کی دکان پر چلا آیا اور طلبہ کی آمد تک تقریباً ایک گھنٹہ ان کے پاس بیٹھنے اور مولانا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔

اگر میاں عبدالرؤف توجہ دیں تو وہ اپنے والد بزرگوار کے ملفوظات جمع کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہوگا۔

تفسیر ابن کثیر کامل

مکتبہ فیض القرآن دیوبند نے اس کتاب کو شائع کیا ہے۔ آجکل یہ کتاب مکتبہ برہان میں ملتی ہے۔ آرڈر بھیجیے

غیر مجلد قیمت: -/250 مینیجر مکتبہ برہان دہلی۔

© rasailojaraid.com